IJAER/ March-April 2023/Volume-12/Issue-2 ISSN: 2278-9677

International Journal of Arts & Education Research

کرناٹک کے اردو فکشن میں تہذیبی وسماجی جھلکیاں

از۔ ڈاکٹر الیاس احمد، پٹویگر۔ اسسٹنٹ پروفیسر۔ شعبہ اردو، نہرو ڈگری کالج، ہبلی، کرناٹک

Dr. Iliyas Ahmed Patwegar, Asst Prof, Dept of Urdu, Nehru Degree College, Hubli- karnataka

ادب اور زندگی کا تعلق ایسا ہی ہے جیسے جسم کا روح سے اور پھول کا خو شبوسے ہے ۔ روح کے بغیر جسم بے کار اور خوشبو کے بغیر پھول بے قیمت اسی طرح زندگی کی نیرنگیاں اگر ادب کے دامن میں نہ سمائیں تو پھر ایسے ادبی سرمایہ کی کوئی وقعت نہیں ہوتی ۔تہذیب و تمدن اور ثقافت کچھ ایسے اقدار ہیں جن کے خمیر سے زندگی اور معاشرے کی ایک شناخت بنتی ہے ان میں کچھ اقدار خاص ہوتے ہیں تو کچھ تمام طبقوں میں مشترکہ ہوتے ہیں ۔ کچھ تہذیبی وتمدنی اور سماجی اقدار قائم و دائم رہتے ہیں تو کچھ وقت کے ساتھ بدل جاتے ہیں۔خیالات وجذبات کے اظہار کے لئے زبان ضروری ہے اور یہ خیالات جب الفاظ کے پیکر میں ڈھلتے ہیں تو ادب وجود میں آتا ہے اور یہی اپنی قوم کے تہذیب و تمدن ، مذہبی عقائد، سماجی اور معاشی حالات کا ترجمان ہوتا ہے۔ وقت اور حالات کے ساتھ تہذیب وتمدن میں کچھ تبدیلی بھی آتی ہے توپرانی نسلیں اس کی مخالفت کرتی ہیں تو نئی نسلیں اس کی مدافعت میں کھڑی ہوجاتی ہیں اس طرح کچھ اقدار وقت اور حالات کے سانچے میں ڈھل کر آگے بڑھتے ہیں تو کچھ تاریخ کا حصہ بن جاتے ہیں تو آنے والی نسلیں کم از کم ان دستاویزی حوالوں کی مدد سے ان سے واقف ہو سکتی ہیں ورنہ داستان پارینہ بن جاتی ہیں بقول سید سلیمان ندوی ۔۔

انسان کے تمام اعمال اس کے خیال کے ماتحت ہیں خیالات کی روح الفاظ کے جسم میں جلوہ گر ہوتی ہیں ۔ الفاظ زبان کا ’’

‘‘ دوسرا نام ہے اس لئے کسی قوم کے زبان کے معنی ہیں اس قوم کا تمدن و تاریخ ، مذہب و جذبات ۔

(نقوش سلیمانی ۔ سید سلیمان ندوی ۔ ص 67)

ایک دور تھا کہ انسان کا تعلق اپنی زبان وادب سے انتہائی گہرا تھا اس میں ہر جذبے کے اظہار کے لئے گنجائش تھی اس کے رہن سہن ، رسم ورواج سب کچھ ادب کے دامن میں سمایا ہوا تھا پچھلے زمانے میں شادی کی تقاریب کئی دنوں تک ہواکرتی تھیں ۔ تعلیم میں اخلاقی اقدار کو کافی اہمیت دی گئی تھی بچوں کی تربیت پر خاص توجہ دیتے ہوئے گلستاں بوستان ، چارکرسی اورکریمیہ نامہ ابتدائی جماعتوں سے ہی پڑھائی جاتی تھیں جن کے اثرات بچوں کی زندگی پر تادم آخررہتے تھے ۔ اسی تعلیم کا نتیجہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں شاہ ولی اللہ شاہ عبدالعزیز دہلوی ، شاہ عبدالقادر شاہ رفیع الدین ، مولانا فضل حق خیرآبادی اور مفتی صدرالدین جیسے اکابر علماء غلام رلی دہلوی ، شاہ کلیم اللہ دہلوی اور حاجی امداد اللہ جیسے بزرگ ، میر ، درد ، غالب ، مومن ، اکبر الہ آبادی علامہ اقبال جیسے بلند پایہ شاعر سر سید ، حالی اور شبلی جیسے مفکر ہمارے درمیان پیداہوئے ۔

اردو نثر کا جائزہ لیں تو یہ پتہ چلتا ہے کہ منشی پریم چند نے ہماری زندگی کے اچھے برے پہلوئوں اور اقدار کو کہانی کے قالب میں ڈھالا پھر یہ سلسلہ چل نکلا ۔ اس حوالے سے جب ہم ریاست میسور کے اہم مراکز بیدر، گلبرگہ ، بیجاپور، میسوراور سررنگا پٹن کے علاقوں کا جائزہ لیتے ہینتو پتہ چلتا ہے کہ یہاں اردو زبان کی آبیاری ہوئی اور دیگر علاقوں کی طرح یہاں کی رنگا رنگ تہذیب اور طرز معاشرت کی ترجمانی کرتے ہوئے یہ اتحاد و یکجہتی کی نقیب بنی ۔ ہمارے ادباء و شعراء نے دیگر علاقوں کے ادیبوں کی طرح یہانکے علاقوں کی رنگا رنگ تہذیب و طرز معاشرت کے مختلف پہلوئوں کو تخلیقات کے پیکرمیں ڈھالا ہے

کرناٹک مینااردو زبان و ادب کا ارتقاء ۱۵ وینصدی سے ہی ہونے لگاتھا۔ قدیم میسور کے مختلف علاقونمینمغل اور عادل شاہوں کی آمد سے اردو زبان و ادب کے فروغ کے لئے ایک مستحکم بنیاد قائم ہوئی تاہم بیجاپور میں عادل شاہوں کے ہاتھوں پروان چڑھنے والے دکنی ادب کی سلطنت خداداد خصوصاً ٹیپوسلطان کے عہد مینمز یدتوسیع ہوئی۔ عہدِ سلطنتِ خدا دا د کے دکنی ادب کا جا ئزہ لیں تو یہ محسو س ہو تا ہے کہ اس دور کے نثری ا ور شعری سرما یے پر تصوف کے گہرے اثرات کار فرما نظر آ تے ہیں ۔اس دور کے ادب پر صوفیانہ اور مذہبی رنگ اتنا گہراتھا کہ سقو طِ سلطنتِ خدادا د کے ا یک طویل عرصے بعد بھی دور وڈیر راجگان کے تقریبا دیڑھ سو سا لہ عہدِ حکو مت میں بیسو یں صدی کے ا وا ئل تک یہ مذ ہبی ا ور صو فیا نہ رنگ غا لب رہا۔ اس پو رے عر صے کے دوران ریاست کا اردو ادب ریا ست کے کنڑ ی ادب اور بیرون ریاست ا ردوحلقو ں میں ہو رہے ادبی ہنگاموں سے کسی قدر بے نیاز رہا ۔حا لا نکہ کنڑ ادب میں انیسویں صدی کے آخری دہے میں فکشن نگاری کا با قا عدہ آ غا ز ہو گیا تھا ا ور سب رس ، علی نا مہ ، سکندر نا مہ جیسی بزمیہ ا ور رزمیہ دا ستا نوں کے علا وہ عہدِ سلطنتِ خدا دا د میں منظرِ عا م پر آ نے وا لی تصا نیف ا ور تا لیفا ت میں مقا می تہذ یبی و تمد نی ا ور سما جی جھلکیا ں کہا نی کے روپ میں مو جو د تھیں۔اس کے باوجود یہا ں کا اردو ادب فکشن کے سا تھ ہی سا تھ ا پنے دور کے تہذیبی و تمد نی آثا ثے کو تخلیقی ا صنا ف میں محفو ظ کر نے کی ضر و رت ا

 ISSN: 2278-9677

ور اہمیت کو محسو س نہیں کر سکا۔ جبکہ نصر تی کی سکندر نا مہ اور علی نا مہ جیسی رزمیہ دا ستانو ں میں اپنے دور کے رہن سہن، ما کو لات، رسم و رواج کے علا وہ جشنِ نو روز اورجشنِ فتح جیسے ا ہم تہوا روں کا کہیں تفصیلی تو کہیں بر سبیل تذکرہ کتا بی شکل میں مو جو د تھا۔

ء میں علا مہ ا قبا ل کے دورۂ میسو ر کے مو قع پر علا مہ نے یہا ں کی تا ریخ کو قلمبند کر نے کا مشورہ دیا تو محمو د خا نمحمو د بنگلو 1929 ری نے نا ول حیدر علی، افسا نوں اور ا پنی معر کتہ ا لآراء تصنیف "تا ریخِ سلطنتِ خدا داد" کے ذریعہ یہا ں کے تہذ یبی و تمد نی ا ور سیا سی و سما جی حا لا ت کو قلمبند کر کے آ نے وا لے فن کا روں ا ور قلمکا روں کے لئے ا یک نئی راہ دیکھا ئی۔ گو یا گلبرگہ ا ور بیجا پو ر کی صوفا نہ ا ور ا دبی فضا ؤں مینجنم لینے وا لی یہ تخلیقا ت بیسویں صدی میں قدم رکھا تو اس میں ا پنے عہد کے تہذیبی و تمدنی اقدا ر اور حا لات کو ا پنے دا من میں سمیٹنے لگیں۔

بیسو یں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی ریاست کے لکھنے والوں کا رسالوں کے ذریعہ اردو کے دیگر مراکز سے رابطہ قائم ہوا تو تحر یری سطح پر ا س رنگ کو بر تا گیایعنی یہ رشتہ تمام تر قلمی تھا ان کے اپنے ماحول میں تخلیقی ادب کے رموز و نکات پر بحث و مبا حثہ اور ادبی تقاضوں کا شعور عام نہیں تھا ۔یہاں کے ادب پر گویا ایک جمود طاری ہوگیا تھا اس جمود کو بعض ایسے طالب علموں نے توڑا جو میسور سے حصول علم اور تلاش معاش کی غرض سے علی گڑ ھ ،بمبئی اور اسکے اطراف و اکناف کے علاقو ں میں گئے۔

مختلف ادبی تحریکات اور رجحانات سے واقف نوجوانوں نے ریاست میں فنی نقطہ ء نظر سے حقیقت پر مبنی اورعوامی جذبات و احساسات کی ترجمانی کرنے کا بیڑہ اٹھا یا ان میں میمونہ تسنیم ،ابراہیم جلیس ،صمد شاہین ،ممتاز شیریں،مظہر امید ،محمود خاں محمود بنگلوری ،ملا عبدالغنی ،عصری چک منگلوری ،شاہ ابوالحسن ادیب اورمحمود ایاز چند قابل ذکر قلم کار ہیں ۔ان فن کاروں کے شعور نے گرد وپیش پر پربھی نگاہیں ڈالنی شرو ع کیا اورتقلید سے ہٹ کر مسائل حیات کے بارے میں ذاتی تجربات اور مشاہدات کا فنی اظہار کرنے کی طرف توجہ دی ۔ اس لحاظ سے ریاست میں ۱۹۳۶ کے بعد ہی حقیقت پر مبنی ادب کی طرف توجہ دی اسطرح اس کی اپنی ایک روایت قائم ہوگئی۔ میسور کے اردو فنکار ملک کے دیگر بلند پایہ ادبا و شعرا ء کے دوش بدوش چھپنے لگے ان کے حصے میں مقبولیت آئی ان میں ممتاز شریں ،صمد شاہین ، میمونہ تسنیم ،سیدہ اختر ،سلیم تمنائی ،ملاعبدالغنی ،عصر ی چک منگلوری ،شاہ ابوالحسن ادیب اور محمود ایاز قابل ذکر ہیں ۔ممتاز شریں اور صمد شاہین نے چالیس کے دہے میں رسالہ ’’ نیادور ‘‘کے ذریعہ اور محمود ایاز نے ’’سوغات‘‘کے ذریعے ادبی بحث و مباحث کے لئے راہیں استوار کی مذید مختلف اخبارات کے ادبی شماروں نے بھی یہاں کی ادبی فضا کو نئے رجحانات و نظریات سے اور قلم کاروں کو باخبر رکھا ۔

ممتاز شیریں کا شہر ہء آفاق مضمون ’’تکنیک کا تنوع‘‘ اردو ادب میں آج بھی ایک اہم مقام رکھتا ہے۔محمود ایاز کا ’’سوغات ‘‘کئی حوالوں سے جدید نظم کے آغاز و ارتقاء میں کافی اہم کردار اداکیا ہے ان تمام حقائق کے باوجود کچھ بد بختیا ں بھی ان پر سایہ فگن رہیں ۔ان فن کاروں کے تخلیقی فن پر باقاعدہ گفتگو نقد وتبصرہ یا تبادلہء خیال کے لئے سازگا ر فضا میسر نہیں ہوئی اور یوں قاری کے ساتھ اس کا کو ئی موثر رشتہ استوار نہ ہوسکا یہی وجہ ہے کہ اکثرفن کاروں کو ان کے فن کی خاطر خواہ پذیرائی نہ ہونے کا خلق بھی رہا ۔سلیمان خطیب نے دکھنی زبان یہاں کے رسم و رواج کو اپنی شاعری کا موضو ع بنایا انہیں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کے مزاحیہ شاعری اوروہ بھی دکھنی زبان میں کافی مقبول ہوئی اسکے باوجود انہیں وہ پذیرائی نہیں مل سکی جس کے سلیمان خطیب مستحق تھے چنانچہ ایک قطعہ میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

میں رستے کا پنتی ہوں دیپک ہونفن کا

یہ سارا اجالا ہے میرے سخن کا

مجے نیچ پہچانے لوکانچ میرے

میں انمول ہیرا ہوں دکھن کے کھن کا

(کیو ڑ ے کا بن ... سلیما ن خطیب.. ص 271)

نعتِ شریف میں بھی آپ نے دکھن کے لب و لہجہ کی چاشنی کے ساتھ حضورﷺ سے اپنی عقیدت و احترام کا اظہار کیا ہے وہ بھی اپنی جگہ منفرد و ممتازہے

روضہ پو تیرے راجا واروں تو کیا واروں

میں ہیرے کاں سے لائوں میں موتی کاں سے لائوں

آنکھو میں میرے آنسو آنسو چڑھانے آیوں

(نعتِ شر یف .. کیو ڑ ے کا بن ... سلیما ن خطیب.. ص 16)

Copyright@ijaer.org

ا س کے علا وہ بس ایک نظر خو ا جہ، بہلی جمعگی، عید کے دن، ہپی کٹ، با رگا ۂ بندہ نو ا ز میں ایک پیا م، ڈھو لک کا گیت، سا س بہو ، ہر ا ج کا پلنگ، مو ٹ کا پا نی ،پہلی تاریخ ،آخری تاریخ ،ڈھولک کا گیت ،ساس بہو ،چھورا چھوری،لکھنوی شاعرکی دکھنی بیوی، محبو ب صا حب۔ محبو ب بی، بھو ت مزا ہے(بہت مزا ہے)، د کنی عو رت کا انتظا ر، کا ٹو کھیتیا ں کا ٹو رے، کمبی، پیا را وطن، ہما لہ کی چا ندی، گلبر گہ میں پا نی کی قلت پر لکھی گئی ا یک نظم:بند ہو ئے نل چلو، مد رسہ محمو د گا وا ں کا ایک مینا ر، آہ ڈاکٹر زور، سرور ڈنڈا کی نا گھا نی مو ت پر لکھی گئی نظم ’’آخر ی دیدا ر‘‘ا ور مخدوم ا ن کی چند نما ئندہ نظمیں ہیں جن میں یہا ں کا لب و لہجہ، رہن سہن ،سما جی حا لات ا ور تہذ یب و تمدن کے خو بصو رت مر قعے د کنی زبا ن میں ملتے ہیں۔ یہ چند متفر ق ا شعا ر اس کی مثا ل ہیں۔

تجھے معلوم ہے کی ا تا خوشی سے آیوں

مجھے آتے سوبی نیں آتے سو گانے گایوں

آدھی بریانی بھی ہوٹل میں دبا کو کھایوں

دیکھ جبیق میں ترے واسطے کیا کیا لایوں

بول گلے میں ترے واسطے کیا کیا ہونا آج تنخوا ہے آج ہے سونا

بس کرو بھوت ہوا شیخی بگھارو نکو

کھٹے میٹھے مجھے باتاں میں مٹھارو نکو

گھولنا ں سے تمے شیشے میں اتارو نکو

باتاں باتاں میں تمے لاتاں بی مارو نکو

(پہلی تاریخ ۔ سید سلیمان خطیب۔ کیوڑے کا بن ۔ ص 30)

بولو خالہ مزاج کیسے ہیں ؟

کتنے برسوں کے بعد آئی ہو

مسی ہونٹوں پہ آنکھ میں کاجل

جیسے پیغام کوئی لائی ہو

انگلی ناخن کو کچھ تو ناطہ ہے

اپنا اپنوں کے گھر کو آتا ہے

میرے چھورے کو چھوری ہونا ہے

میرا چھورا تو پکا سونا ہے

تمے دل میں ذرا نکو سوچو

ہاتھ آیا سو ہیرا کھونا ہے

چار لوگاں میں اس کی ابرو ہے

جیسے کیوڑے کے بن میں خوشبو ہے

کھلے دل کی ہوں سب بتاتی ہوں

بات پھلیچ میں سناتی ہوں

تمے کاں تو بی لڑنے بیٹھینگے

کھلا مکلایچ میں بتاتی ہوں

چھورا ترپٹ ہے ہور ملا ہے

سیدھی آنکھی میں اس کی پھلا ہے

منھ پو چیچک کے خالی داغاں ہیں

رنگ ڈانبر سے جرا کھلا ہے

ناک نقشے کا کتا اچھا ہے

میرا بچہ تو ہور بچہ ہے

(چھورا چھوری ۔ سید سلیمان خطیب ۔ کیوڑے کا بن ۔ ص 53, 54)

ہونے والے کی عید ہوتی ہے

اپنی مٹی پلید ہوتی ہے

ہمنا غم ہے تو بیٹا یہ غم ہے

بارہ دیگاں میں دیگچی کم ہے

بیچ پورا جہیز ہے دیکھو

پاواں ہلتا سو میز ہے دیکھو

کتا سمجھا کو بولی بیچاری

برف جمنے کی دیتا الماری

(پہلی جمعگی ۔ سید سلیمان خطیب ۔ کیوڑے کا بن ۔ ص ۔ 99)

پکے کلیاں کے سیجاں سجا کو رکھیوں

پکے پانا ں کے بیڑے بنا کو رکھیوں

سوندھے گھی کے چراغاں جلاکو رکھیوں

میں تو چوکھٹ پو دیدے لگا کو رکھیوں

پھولا ں ، بیلاں کے زلفاں سجانے لگے

پتے ہریالے آنچل اڑانے لگے

جگنو رستے میں دیپک جلانے لگے

رستے اٹھ اٹھ کو رستہ دکھانے لگے

(دکنی عورت کا انتظار ۔ سید سلیمان خطیب ۔ کیوڑے کا بن ۔ ص 174)

سلیما ن خطیب نے ا پنے کلا م میں ا ن علا قا ئی نیرنگیو ں کی جو عکا سی کی ہے وہ علا قا ئی ا دب کے مو ضو عا تی ا نتخا ب میں ا یک سنگِ میل کا مقا م رکھتی ہیں۔ یہی و ہ مو ضو عا تی رنگ ہے جو آ گے چل کر فکشن نگا روں کے لئے بھی یہا ں کے لب و لہجہ کو ا پنی

تخلیقا ت میں بر تنے کا حو صلہ عطا کیا، ورنہ اس سے قبل ا فسا نو ں ، نا ول اور ڈرا مو ں میں شما لی لب و لہجہ کے سبب مکا لمو ں میں کسی قدر تصنو ع کا شا بہ نظر آتا ہے۔

گویا داستان سے افسانے تک کے ا س سفر میں تمام اصناف کسی نہ کسی طرح اپنے عہد کے آفریدہ اور پروردہ رہے ۔ریاست میں داستان کی دلفریب وادیوں سے نکل کر فکشن نے جب ناول اور افسانے کے میدان میں قدم رکھا تو اسے بھی اپنے تہذیبی و تمدنی سیاسی اور سماجی جھلکیوں سے منور کر دیا۔ چاہے و ہ میمونہ تسنیم کے افسانے ہوں ناول سوز ناتمام ہو یا محمود خاں محمود بنگلوری کی تخلیقات ممتاز شیریں کے افسانے ہر تخلیق میں علاقائی تہذیب و تمدون کی خوشبو رچی بسی ہوئی تھی سلیم تمنائی ،ملاعبدالغنی ،خلیل منظری ،یوسف عارفی،خلیل خاور ،اصغر علی چک منگلوری،ش نذیرالدین ،م ن سعید ،فرحت کمال ،قاضی انیس الحق ،ضیا جعفر ،ابوتراب خطائی ضامن ،انل ٹھکر ،حمید سہر وردی ،شکیل رضا ،فیاض قریشی ،خلیل فتح،فریدہ رحمت اﷲخان ،ثنا اﷲچراغ ہبلوی اور تازہ ترین افسانہ نگار دائود محسن چند ایسے اہم فکشن نگار ہیں جن کی تخلیقات میں مقامی تہذیبی تمدونی سماجی اور سیاسی اقدار کی عکاسی ملتی ہے

میمونہ تسنیم کے افسانے چوڑیا ں، منزل ،کنٹرول کے علاوہ ناول سوز ناتمام میں بھی جابجا یہانکے تہذیبی عناصر موجود ہیں زبان بھلے شمالی رنگ میں رچی بسی ہو لیکن اسکا تمام تر سماجی پس منظر ملناڈ کے علاقوں کا ہے ۔محمود خان محمود بنگلوری کے افسانوں کے مجموعے ''انقلابات ہیں زمانے کے اور اتفاقات ہیں زمانے کے ''اور ناول حیدر علی میں کردار واقعات اور ان کا رہن سہن سب خالص میسوری طرز کا ہے چاہے وہ ٹیپو سلطان اور نجومی کا واقعہ ہو یا ناول حیدر علی میں بد نور ،سری رنگا پٹنم کا علاقہ اور اس کے کردار سب مقامی ہیں جشن و جلوس شادی بیا ہ میں سب میں علاقائی رنگ جھلکتا ہیں ۔

ممتاز شیریں کے افسانے موضوع کے اعتبار سے زمانی ومکانی قیود سے آزاد ہوکر بھی اس کا سماجی پس منظر جنوبی ہندوستان ہے ۔ کفارہ ، آئینہ اور انگڑائی اس کی مثال ہے۔ممتاز شیریں کے افسانوں میں جنوبی ہندوستان کے خواتین کا رہن سہن اور ان کا عادات و اطوار کا ذکر ملتا ہے ۔ ممتاز شیریں کے افسانہ آئینہ میناماامی بی کا کردار مجسم جنوبی ہندوستان کی ایک وفا شعار بیوی کی علامت نظر آتا ہے ۔ شوہر کے ہزار ظلم بھی منظور ہے لیکن شوہر کے گھر سے باہر جانا گوارا نہینبھائی صاحب امامی بی کو اپنے گھر لے جاتا ہے تو اپنے ساتھ شوہر کے خریدے ہوئے ٹوٹے ہوئے آئنیہ کی کرچیاں یادگار کے طورپر لے جاتی ہے یہی آئینہ ہے جس میناسے اپنا منہ دیکھنا گوارا ہے اسی میں دیکھ کر چوٹی کنگھائی کرتی ہے کچھ عرصے بعد شوہر جب بلانے آتا ہے تو بھائی کے لاکھ منع کرنے پر بھی تمام ظلم و ستم کو بھول کر بھائی کی ناراضگی کی پرواہ کئے بغیر شوہر کے ساتھ چلی جاتی ہے ۔ بھائی کے گھر سے نکلنے کے بعد اتنی خودار ہے کہ شوہر کے مرنے کے بعد بھی دردر کی ٹھوکریں کھانا منظور ہے لیکن بھائی کے گھر کا کبھی رخ نہینکیا آخری دم تک اسی طرح زندگی بسر کرتی ہے ۔

آئینہ میں یہا ں کی ریت رواج کا بھی خاصہ ذکر ہے نانی بی کے ناک جھدوانے کی ریت ،سر میں تیل ڈالنے گر یز کر تی لڑ کیو ں کو دیکھ کر نا نی بی کا ا ظہا رِ ا فسو س ، فیشن کے نا م پر روکھے بال سر سے دوانگل (انچ) اوپر اٹھے تیڑھی مانگ نکالنے پر اعتراض، ان کے لباس پر اعتراض کہ سہاگن بھی اب اجلے (سفید) کپڑے پہننے لگیں ۔شادی بیاہ کا ذکر کرتے ہوئے نانی بی کہتی ہیں ۔

ہمارے زمانے کی شادیاں تھیں کئی ہفتے لگتے تھے کیسی کیسی رسمیں اب دیکھو چٹ منگنی پٹ بیاہ اور بیاہ بھی ''

کیسا ادھر نکاح پڑھایا ادھر دلہن کی رخصتی نہ کوئی رسم نہ ریت ---- اور اب کی دلہنیں تو خالہ اباری چھوریاں تو بہ توبہ

آنکھ کاپانی بھی گیا ہے کیسی ہنستی خوشی رخصت ہوتی ہیں اپنے صنم کے گھر کو ہم تو تین تین روز تک آنکھ کا پانی نہ سوکھتا تھا ۔

رو رو کے بے سدھ ہوجاتے تھے اللہ کیا زمانہ آیا ۔

(آئینہ ۔ ممتاز شیریں ، اظہارِ نو ا۔ ص 72)

بدلے حالات اور لڑکیوں میں آرہی تبدیلی کا ذکر کرتے ہوئے کہتی ہیں ۔۔

پرسوں میں ایک شادی میں گئی تھی اماں کاہے کو بولوں اس دلہن کی بات سی ۔۔جب اس کی ہم جولیاں چھڑ چھاڑ''

کر رہی تھیں تو ہنس رہی تھی بھری مجلس میں نوشہ کے گھر والے بھی پاس بیٹھے تھے توبہ توبہ ہم پر تو گھڑوں پانی پڑگیا ۔۔

رخصتی کا وقت آیا تو وہ تیار بیٹھی تھی ۔ میرے اللہ ایک بوند بھی نہ تھی اس چھوکری کے آنکھوں میں ۔ نابابا ہم سے رہا نہ گیا ،

آخر بیٹی والوں کی لاج رکھنی تھی سمندھنوں کے سامنے ہم دو چار بوڑھیوں نے مل کر کپڑے برابر کرنے کے بہانے سے

'' اتنے زور سے نوچا کہ اس کی چیخ نکل گئی جب کہیں جا کے دو بوند پانی نکلا ۔

(آئینہ ۔۔ ممتاز شیریں ۔۔ اظہار نو ۔ ص 72, 73)

نانابی کی پان کھانے کا تذکرہ دراصل اس دور کی بڑی بوڑھیوں کے عادتوں کی نشانی کہہ سکتے ہیں ۔ ڈگڈگرد بجانے والے مداری کا کھیل اور شادیوں میں دئے جانے والے زیورات کا ذکر بڑے چاؤ سے کیا ہے ۔ اس زمانہ میں شوہر کا نام لینا معیوب سمجھا جاتا تھا افسانہ نگار نے بوڑھیوں کے لب ولہجہ کو بھی کامیابی کے ساتھ بیان کیا ہے ۔

میمو نہ تسنیم کے ا فسا نو ں میں بھی ملنا ڈ علا قے کی تہذیبیو تمدنی جھلکیا ں ملتی ہیں۔ افسانہ ممتا، زود پشیما ں نقشِ وفا ا ور چوڑیا نمیئمیمونہ تسنیم نے میسور کے مسلم گھرانوں کی تہذیب وتمدن اور رہن سہن کی خوبصورت جھلکیا ں پیش کی ہیں۔ ما متا میں خا تو ن اور نا صر کے درمیا ن گفتگو کے یہ چند جملے اس کی مثا ل ہیں۔

ہم لو گو ں کے ہا ں تو نہیں جا رہے ہیں۔ کو ئی کیا کہے گا۔ ا ماں جا ن نے ا جا زت دی ہے۔ ''

''کب ا جا زت ملی؟ میں خود ما ں سے پو چھنے و ا لا تھا مگر جراء ت نہ کر سکا

(ما متا ۔میمو نہ تسنیم مطبو عہ شعا عِ ا ردو، کر اچی جو لا ئی 1943 ص 34)

سلیم تمنائی کے افسانوں میں بھی کردار ،زبان اورر سم ورواج سب میں اسی علاقے کی مٹی کی خوشبو رچی بسی ہے ۔ لاڈلا بیٹا ، پیارا پیسہ ، ایک ہستی ایک انجمن اور ٹوٹ گیا سپنا میرا اس ضمن میں قابل ذکر افسانے ہیں ۔ ٹوٹ گیا سپنا میرا مینفریدہ اور اسکی نوکرانی رحیمہ کی شادی کے رسم ورواج کا بڑا خوبصورت ذکر ملتا ہے ۔ یہ رسم ورواج اب داستان پارینہ بنتے جارہے ہیں فریدہ کی شادی جہاں متمولی گھرانے کی شادی کا مرقع ہے تو رحیمہ کی شادی دراصل غریب گھرانوں میں انہیںرسومات کی دوسری تصویر ہے اس کے چند اقتباسات بھی ملاحظہ ہو

نکاح سے پہلے دن شکرانے کا اہتمام کرتے ہوئے شام میں مٹھائی کے ساتھ دولہا والوں کی دولہن کے گھر آمد نند کا دولہن کے سراور کانوں کو چھوکر چاندی کی تھالی میں سکے ڈال کر دولہن کی بلائینلیتے ہوئے انگلیا ں چاٹنا ، حاضرین کا خوش ہونا ، یہ تٹ تٹ کی آواز دراصل نند کو دولہن سے محبت کا ثبوت ہے ۔ نکاح کے بعد جلوے کا اہتمام ۔ جلوے میں کہے جانے والے جملے مثال کے طورپر ملاحظہ ہو

کہو بھائی نوشاہ پیارے عارس (دولہن) میٹھی کہ مصری ؟ ''

دولہا مسکرایا اور خاموش

ارے یہ تو دولہن کی طرح شرماتے ہیں

نہیں نہیں بے چارہ گونگا معلوم ہوتاہے ، چھی چھی چاند سی دولہن کے پھوٹے نصیب

کہہ دے پیارے عارس میٹھی کہ مصری ؟

مصری : دولہا نے مسکراکر جواب دیا :

اوئی ماں یہ ابھی سے شوہر بننا چاہتا ہے

کہو کہ عارس میٹھی

دولہا مسکرایا ؛ مصری تو چکھی ہے دولہن کو کیسے کہوں مصری ؟

'' اوئی توبہ اس مردوے کے دیدے کا پانی مرگیا ہے

(ٹوٹ گیا سپنا میرا،،روشنی کی کھوج ۔ سلیم تمنائی)

اس کے بعد سلامیوں کا سلسلہ ، رخصتی کا منظر ، والدین اور دولہن کا رونا بلکنا ، شب عروس میں دولہن کا گردن جھوکائے چھوئی موئی بنی بیٹھنے کا منظر سب اس روایت کا ایک حصہ ہے جو یہاں متوسط اور مالدار طبقے کی شادیوں میں عموما دیکھنے ملتاہے ۔ غریب لڑکی بھی سپنے سجائے نازونخرے کرے اس کی بھی رخصتی ہو لیکن یہ صرف ایک سپنا ہوتا ہے جو دولہا کے لفظ دھکوں سے ٹوٹ جاتاہے رحیمہ کی شادی کا بھی وقت آتا ہے فریدہ بڑے شوق سے شادی میں حصہ لے رہی ہے رحیمہ کی پلکوں پہ بھی ہوبہی سپنے سجے ہیں جو اس نے فریدہ کی شادی میں سجائے تھے ، رحیمہ دولہن بنی بیٹھی ہے دولہے کی محبت بھری آواز سننے کے لئے متمنی ۔گھر کی بوڑھی نوکرانی فریدہ کے

اشارے پر چھڑچھاڑ شروع کردیتی ہے ۔افسانہ لاڈلا بیٹا پیارا پیسہ میں یہاں کے مزدور اور کسان طبقے کی زبان ان کی معاشی پریشانیوں کا ذکر بڑے ہی خوبصورت انداز میں ملتا ہے ۔

کسانوں کی تمام تر ضروریات کا دارومدار فصلوں پر ہوتا ہے اچھی فصل کے لئے بارش ضروری ہے اور ان علاقوں میں بارش کے لئے مختلف رسم و راج بھی رائج ہیں ۔ افسانہ لاڈلا بیٹا پیارا پیسہ ابتداء سے آخر تک ان علاقائی مناظر کا لفظی خاکہ نظر آتا ہے ۔ مثال کے طورپر یہ اقتباس ملاحظہ ہو جس میں یہاں کی زبان اور عقائد کی عکاسی ملتی ہے ۔

کیا کروں سیٹھ صاحب ۔ یاں کا حال اپیچ (آپ ہی) دیکھ ریں ۔ اب تک بارش ہونا تھا مگر بھگوان چپ ہے ۔ ''

مسجداں اور دیولاں (مندروں) میں دعایاں بھی کئے ۔ مینڈکیاں (مینڈک) کی شادی بھی کئے ہری کتھا بھی کرائے

'' پر کچھ بھی نہیں ہوا ۔ کی کی (نہ جانے کیوں) بھگوان انکھیاں موچ لیا ہے ۔

(لاڈلا بیٹا پیارا پیسہ ۔ روشنی کی کھوج ۔ سلیم تمنائی)

اسی طرح ان کے تقریبا۔تمام ڈراموں میں بھی علاقائی تہذیبی و تمدنی جھلکیاں مل جاتی ہیں ۔ غالب کی واپسی ، گڑیا کا بیاہ ، اللہ کے پیارے ، اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے ، جنگل جاگ رہا ہے ، بھوت اور جنگل کانپ گیا میں کسی نہ کسی حوالے سے یہاں کے تہذیبی عناصر موجود ہیں ۔ ''غالب کی واپسی'' میں میسور کی مہارانی کالج کے حوالے سے یہاں کی تعلیمی صورتحال اور خصوصا اردو اور ہندی کی تعلیم کی داستان بیان کرتے ہوئے آپ نے اردو ادب خصوصا غالب کی ان علاقوں میں مقبولیت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ غالب کا کلام نہ صرف ادبی حلقوں میں بلکہ یہاں کہ راجہ کے دیوان سرمرزا اسماعیل بھی غالب کے کلام کے شیدائی تھے۔ یہی نہیں سلیم تمنائی نے مس دکنی ، مس شیطان اورمس سہیلی جیسے کرداروں کے ذریعے یہاں کی زبان کا اردو اور ہندی سے موازنہ کیا ہے

گڑیا کا بیاہ'' میں یہاں کی شادی بیاہ کے کچھ الگ رنگ دکھائے گئے ہیں ۔ ا گر '' ٹوٹ گیا سپنا میرا '' میں نکاح اوررخصتی سے '' جڑے رسم و رواج کی جھلکیاں ہیں تو اس ا فسا نے میں رشتہ مانگنے کے یہاں رائج طور طریقے دکھائے گئے ہیں ۔ شاہدہ اور نجمہ دوسہیلیوں کے درمیان گڑیا کا بیاہ کے سلسلے

میں ہوئی گفتگو دراصل یہاں رشتے طے کرنے کے لئے رائج اصول کی عکاس ہے ۔ شاہدہ جب چھٹیوں میں گڑیوں کی شادی کی تجویز پیش کرتی ہے تو نجمہ فورا تیار ہوجاتی ہے لیکن شاہدہ اسے ٹوکتے ہوئے کہتی ہیں ۔'' شادی کا معاملہ ہے گڑیوں کا کھیل نہیں '' پھر یہاں سے رشتہ طلب کرنے کے طور طریقے اور مہنگائی کا رونا ، لین دین کے سلسلے ، لڑکے اور لڑکی والوں میں پیدا ہونے والی غلط فہمیاں اور اچھی دعوت کے لئے بحث و تکرار کا ذکر بھی ملتا ہے ۔

اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے '' میں یہاں کے آم کے باغات کی جھلکیاں ہیں جبکہ ریڈیائی ڈرامہ بھوت میں میسور اور سری رنگا پٹن کی '' تہذیب و رہن سہن کی جھلکیاں ملتی ہیں یہاں فاضل ڈرامہ نگار نے ایک ہوٹل کے کمرے میں رات کے اندھرے مینبلی کی ہلڑ بازی کے پس منظر میں حالات کا ایمائی خاکہ کھینچا ہے خاکوں کے حوالے سے سلیم تمنائی کی مقامی تہذیب و تمدن سے والہانہ محبت کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر طیب انصاری کہتے ہیں ۔

ان شخصیتوں کے ساتھ ان شہروں کی تہذیب ،ادب اور ثقافت کی اہم جھلکیاں بھی دیکھنے کو ملیں گی جہاں تک ''

میسور اور بنگلور کا معاملہ ہے سلیم تمنائی کے لئے تو میسور اور بنگلور گھر آنگن ہیں یہاں کی زبان یہاں کا ادب اور یہاں

کی ثقافت سے سلیم تمنائی نہیں بلکہ سلیم تمنائی سے یہ متاثر ہیں ۔ سلیم تمنائی تو اپنی عمر بھر کا سرمایہ تہذیبی وادبی ان دونوں

'' شہروں میں لگا رہے ہیں ۔

(سلیم تمنائی -- بزرگ چہرہ -- غالب کی واپسی -- ص 8)

گویا یہاں کی اقدار سے ان کی وابستگی اتنی گہری ہے کہ ہر تخلیق ہر تذکرے میں کہیں نہ کہیں سے ان علاقوں کی جھلکیاں نظر آجاتی ہیں ۔ اس محبت کا ذکر کرتے ہوئے آگے لکھتے ہیں ۔

ان کی محبت کم از کم تین خانوں میں بٹی ہوئی ہے پہلا خانہ اردو سے بھرپور دوسرا خانہ میں شیر میسور ٹیپو سلطان ''

'' سمویا ہوا ہے اور تیسرا خانے میں ان کا دل و منشاء شہر میسور بسا ہوا ہے ۔

(سلیم تمنائی ۔۔ بزرگ چہرہ ۔۔ غالب کی واپسی ۔ص 8)

سلیم تمنائی کے دیگر افسانوں میں بھی اسی طرح کے مختلف علاقائی رنگ واضح طور پر مل جاتے ہیں۔ خلیل خاور کا افسانہ شعیب کی بکریا ں یوسف جس گائوں میں ٹیچر ہے وہاں کے حالات ، رہن سہن سب کچھ اس علاقے کے عکاس ہیں ہر گلی ہر گھر میں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی گھر میں کوئی زلیخا اس کی منتظر ہے جس گھر مینبھی جاتاہے وہاں بہاروپھول برسائو میرا محبوب آیا ہے کا نغمہ گونج رہاہے گھر کی ترتیب گائوں کا منظر سب کچھ علاقائی ہے ۔ خضر برگشتہ اور مسا فت نا تمام میں بھی یہ جھلکیانملتی ہیں ۔

سلیم تمنائی کی طرح اس دور کے ایک اور افسانہ نگار عبدالغفور خان سہیل کے افسانوں میں بھی یہاں کی مقامی جھلکیاں دیکھی جاسکتی ہیں ۔ ان کا افسانہ '' ٹانگے والا '' اس کی مثال ہے ۔ یہ افسانہ جب لکھا گیا یہ ایسا دور تھا جب بنگلور اور میسور میں تانگے کی سواری عام تھی ۔ افسانہ میں بنگلور کے گلی کوچوں، یہاں کی درگاہوں میں منتوں ر تانگے والے کے زندگیاوراس کے لب ول لہجے کے خوبصورت خاکے ملتے ہیں۔ افسا نے میں بیٹا ہونے کی خوشی میں بنگلور کے میسور روڈ پر نجومی سے تانگے وا لے قا درکی ملاقات، نجو می کی پیشن گوئی اور پھر بیٹے کا نام رکھنے کے سلسلے میں یہاں کے نامور بزرگ حضرت مردان غیب سے عقیدت کا تذکرہ ہے ۔اس کے ساتھ ہی ساتھ اس طبقے کے لوگوں کا رہن سہن اور لب ولہجہ کی جھلکیاں بھی ہیں ۔ یہاں کے ماکولات کا بھی تذکرہ ہے جب قادر سواری کے لئے چھ آنے کا مطالبہ کرتا ہے تو مسافرکہتا ہے۔

''چھ آنے میں تین مسالے کے چیلے (مسالہ دوسا) ملتے ہیں ۔ ''

(تا نگے وا لا ۔ عبدالغفو ر خا ں سہیل۔۔ اظہار نو ۔۔ ص 31)

اس میں مائولی ٹفن روم (یم ٹی آر) کا تذکرہ بھی ہے جو بنگلور کا ایک قدیم اور تاریخی ریسٹورنٹ ہے ۔یہاں سے بسونگڈی گویا بنگلور کے مختلف علاقوں کی سیر کراتے ہوئے اس دور میں یہاں کے حالات کی قلمی تصویر کھینچی ہے ۔

صمد شاہین کے اافسانے '' بھولے بھٹکے '' میں بیسویں صدی کے چوتھے دہے میں بمبئی کی صورتحال کا تذکرہ ملتا ہے ،تجارت پر بوہری برادری کی گرفت ڈونگری میں عبدالرحمن کا نچ والا کی پارٹی کی طرف سے قوالی محمد علی روڈ اور کالنا روڈ کے ناکے پر بھینڈی بازار میں واقع کا سکر ہاسٹل کا خاکہ ہے ۔ ٹائمز آف انڈیا آفس اور بے روزگار نوجوانوں کی حالت کا ذکر ملتا ہے ۔ صمد شاہین تھے تو بنگلور کے لیکن چوں کہ آپ پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے اور ان کا اکثر شہروں میں آنا جا ہوتا تھا اس لئے انہوں نے اس دور کے بمبئی کی چکا رائو آنند کا افسانہ '' گوری پوجن '' میں چونہ زندگی کو اپنے افسانہ کا موضوع بنایا ۔ تاہم جیسا کہ پچھلے صفحات میں ان کی بیوی ہندو گھرانوں کی رسم ورواج کے علاوہ ریاست میسور کے دہی علاقوں کی منظر کشی ملتی ہے ۔ آم کے باغ ، پیپل کے پیڑ کے پاس چبوترے پر بیٹھے بوڑھے تالاب پر پانی کے لئے آرہی عورتوں اور ان تمام سے گزر کر گوری کے تہوار کا تذکرہ بھی ملتا ہے ۔

م اسمعیل کے افسانے'' ہماری گلیاں'' دراصل شہر بنگلور کے مختلف علاقوں کے رہن سہن کی داستان ہے ۔ اس میں خاص کر صابو صاحب کی ناس

نسوار) کی دکان بازو والے خواجہ سید ین کے دکان ، لال مسجد جو شیواجی نگر بنگلور کی مشہور مسجد ہے ان کا تذکرہ ہے اس میں بائی) گراونڈ سوتھ پریڈ اور سنٹ مارکس روڈ اس سے دور کنٹونمنٹ کے علاقوں مینجئے جانے والی زندگی کا خاکہ ہے ۔

خلیل خاور کے کئی افسانوں میں یہاں کے مقامی تہذیبی رنگوں کی جھلکیاں ملتی ہین تاہم ''شعیب کی بکریاں'' آپ کا ایسا نمائندہ افسانہ ہے جس میں یہاں کے گائوں کی حالت اور جوڑے جہیز کی لعنت سے پیدا مسائل کا تذکرہ بڑے ہی خوبصورت انداز میں کیا ہے جب یوسف اسکول میں ٹیچر کی نوکری کے لئے آتا ہے تو یہاں کئی زلیخائیں ہیں جو اسے رجحانے کی کوشش کرتی ہیں اور وہ اپنا دامن بچانے کی ناکام کوشش کرتا رہتا ہے اس میں ریڈیو سے گونجتی ہوئی محمد رفیق کی آواز میں '' بہاروپھول برسائو میرا محبوب آیا ہے'' کی سحر آنگیز آواز کے ساتھ یوسف کو آزمائش کے کئی کٹھن راہوں سے گزر نا پڑتا ہے ۔

ادیب اختر کے افسانوں میں بھی یہاں کی دہی زندگی کی جھلکیاں ملتی ہیں'' انتم سنسکار'' اس کی مثال ہے ، حنا روحی کے افسانوں میں بھی یہاں کی تہذیبی جھلکیاں ملتی ہیں ،کوثر پروین ،سمیرا ناظم چند دیگر فکشن نگار ہیں کن کی ہاں یہاں وہاں تہذیب و تمدن کی مبہم جھلکیاں ملتی ہیں بیسویں صدی کے چھٹے دہے سے قبل جتنے بھی افسانے لکھے گئے ان میں ان اقدار کے گہرے نقوش ملتے ہیں تاہم بعد کے فن کاروں میں محض چند فکشن نگار ہیں جنھوں نے اس سلسلے کو جاری رکھا ان میں یوسف عارفی ، م ن سعید ، فرحت کمال ، انل ٹھکر اور فیاض قریشی قابل ذکر ہیں ۔

یوسف عارفی ریاست کے ایک اہم فکشن نگار ہیں جن کی تقریبا تمام تر تخلیقات میں ان کا آبائی وطن کرنکوٹ کی آب و ہوا ، خاندانی عظمت کے علاوہ دو نسلوں کے درمیان جاری ذہنی تضاد اور ہمارے علاقوں میناردوزبان کی زبونحالی کے مرقع ملتے ہیناس کے دکھ مینکرنکوٹ سے مہاجرت ،ہندوستان کی تقسیم کے ذکر کے علاوہ خاندانی پس منظر بھی ہے ۔ ایک غیر ضروری آدمی ۔ ایک غیر ضروری آدمی

کی آخری شاپنگ ، بے سمت مسافر ، پھر سفر بے سمت ہوا ، آج کے بعد ، پڑوسی ، اور ایک کہانی مٹتی ہوئی اقلیت کے نام چند قابل ذکر افسانے ہیں جن میں علاقائی اقدار کا پورا تذکرہ ملتا ہے

م ن سعید کے افسانوی مجمو عے : پھوار : میں شامل افسانوں میں بھی یہ علاقائی رنگ اور علاقوں کے تذکرے کی صورت میں مل جاتے ہیں ۔ لکم دینکم ، ہم جنسی ،پھوار ، پناہ کی تھکن ، توبہ کا دن ، اور خدا اس ضمن میں اہم ہیں ان افسانوں میں علاقائی رنگ واضح طورپر دیکھے جاسکتے ہیں۔ قاضی انیس الحق کو تو اپنے علاقوں سے بے انتہا لگائو ہے یہاں کی دکنی زبان سے محبت ہے ٹائٹل افسانہ ’’مسیحا کی موت ‘‘مجموعے کے تقریبا تمام افسانونمیں علاقائی لب ولہجہ اور حالات ومقامات کہانی کا حصہ ہیں ۔ فیاض قریشی کے دونوں افسانوی مجموعے ’’پیاسا شہر پیاسے لوگ‘‘ اور ’’زیرو کنڈول کا بلب ‘‘میں شامل افسانے علاقائی رنگ کے حامل ہیں ۔ کردار اور علاقے قاری کے لئے جانے پہچانے اور مانوس نظر آتے ہیں ۔’’ اب پچھتائے کیا ہوت‘‘ کا آغاز بمبئی کے پس منظر میں لیکن کہانی کلائمکس تک قاری کو بنگلور کے علاقوں کے رہن سہن یہاں کی زبان کے خوبصورت مرقعے ملتے ہیں ۔

فرحت کمال کے افسانوں میں بھی جہاں گوری پالیہ ، شیواجی نگر ، ودھان سودھا ، سٹی مارکٹ جیسے متوسط طبقوں کے تاریخی علاقوں کا تذکرہ ملتاہے وہیں ان افسانوں میں علاقائی رہن سہن بودوباش کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں ۔ ڈونیشن ، اونچے لوگ ، گناہوں کا دیوتا ، سونے کا ہرن ، سرراہ چلتے چلتے اس خصوصیت کے حامل افسانے ہیں ۔ ان کا ناول ’’شیشے کے پائوں‘‘ مکمل طورپر بنگلور کے سرکاری وکٹوریہ اسپتال کے پس منظر میں لکھاہوا ہے ۔ حمید سہروردی کے افسانے تجریدی اور علامتی ہوکر بھی اس میں مسلم کلچر کے بدلتے ہوئے رنگ ملتے ہیں ریت ریت لفظ ، عقب کا دروازہ، بے منظری کا منظر، گھوئے ہوئے راستوں کی شب اور شانتی نگر اس ضمن مینقابل ذکر کہانیاں ہیں ۔ ملاعبدالغنی ، ش نذیرالدین اور انل ٹھکر شمالی کرناٹک کے ایسے نمائندہ فکشن نگار ہیں جن کی تمام تر تخلیقات میں ہبلی دھارواڑ اور اس کے اطراف واکناف کے علاقوں کا رہن سہن ، لب و لہجہ ، منظر اور رسم و رواج کی جھلکیاں مل جاتی ہیں ۔ ملاعبدالغنی کے ناولٹ ’’ نقشی کٹورہ ‘‘ اور افسانے ’’بیمار روشنی ‘‘ اور ’’ایک شام ‘‘اس کی بہترین مثال ہیں

ش نذیرالدین کے افسانہ شروع ہوتے ہیں ہبلی دھارواد کے پس منظر میں اور گھوم پھر کر ختم ہوتے ہیں اسی ماحول میں ۔ ابکائی ، زندہ لاش ،گھوئی ہوئی محبت ، شرنارتھی ، کنارے کنارے ، لمحوں کا سفر ، یہ شام کہاں ہوئی اور آرتی میں علاقائی تہذیبی ولسانی جھلکیانمل جاتی ہیں۔ انل ٹھکر کے ڈراموں سے زیادہ افسانے اور ناول کی کہانی ، کردار ،منظر سب ہبلی دھارواڑ سے جڑے نظر آتے ہیں ان کے ناول خوابوں کی بیساکھیاں اور اوس کی جھیل کے علاوہ بے شمار افسانوں میں خصوصا موسمی پرندے ، انشاء اللہ ،خالی خانے ،گرم برف اور ننہا شہوار چند ایسے افسانے ہیں جس میں اس علاقے کی لسانی و تہذیبی مرقع بدرجہ اتم دیکھے جاسکتے ہیں ۔

اصغر علی چک منگلوری ، کوثرپروین ، چراغ ہبلوی ، داود محسن ، منظوروقار ، سحر امید ، ریاض قاصدار ،حمیدہ نعیم ، ساجد حمید ،راز امتیاز ، احمد عارف ، ضیاجعفر ، مشتاق سعید ،شکیل رضا ،خلیل خاور اور خلیل منظری چند ایسے نمائندہ افسانہ نگار ہیں جن کے یہاںاپنے اپنے علاقوں کی جھلکیاں ملتی ہیں ۔ جلیل تنویر کے افسانوں میں حیدرآباد کرناٹک میں ہونے والی پولیس اکشن کے واقعات کی تاریخ قلمبند ہے ، افسانوں کے مجموعے حصار کی تمام کہانیاں حوالے کے طورپر پیش کی جاسکتی ہیں ۔ خلیل منظری کے افسانے دراصل میسور اور اس کے اطراف واکناف کے علاقوں کے لفظی مرقع ہیں، وال کلاک ، اندھیرا ، شب بھر کا

مہمان ، برگ گل ،ماسٹر چند اور کاروان حیات ومرگ اس ضمن میں قابل ذکر افسانے ہیں ۔

سحر امید کے افسانے دوسری شادی ، آنکھیں ، تاثر محبت ، اور تحفہ اصغر علی چک منگلور ی کے افسانے ایک ڈال دو پنچھی ،رشتوں کا صحرا ، فخرو ، اجنبی رشتے ، مجھے معاف کردو ، میٹھا زہر ، پوجا ، نئے بندھن ، چند ایسے اہم افسانے ہیں جن میں یہاں کے سیاسی ،سماجی و معاشراتی اقدار کی جھلکیاں نظر آتی ہیں

غرض یہاں کے فن کارونے دیگر علاقوں کے فن کاروں کی طرح اپنے علاقونکی عکاسی کو مقدم سمجھا ، یہاں کی تخلیقات کی ایک اور سماجی و معاشی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں کے خواتین افسانہ نگار ہو یا مرد سبھی نے اپنی تخلیقات میں اپنے دور کے اقدار کو جگہ دی ۔تاہم منظر قدوسی ،خلیل فتح ، عصمت عذرا ایسے ناول نگار ہیں جن کے ناولوں میں یہاں کی تمدنی وسیاسی اقدار کا پتہ لگایا جاسکتا ہے ، ابوتراب خطائی ضامن کے ناول ’’ماسٹر ‘‘ میں یہ جھلکیا ں بڑی واضح ہیں ۔ علاقائی

پس منظر میں تحریر مندرجہ بالا اکثر تخلیقات میں آفاقی اہمیت کے حامل ہیں ۔ ساجد حمید کا افسانہ ’’زن نیتی ‘‘لکھا تو گیا ہے علاقائی پس منظر مینلیکن اس کا اطلاق کسی بھی ماحول اور علاقے پر ہو سکتا ہے ۔

جہاں تک ناولوں کا تعلق ہے محمود خان محمود بنگلوری ، میمونہ تسنیم ، فرحت کمال اور انل ٹھکر کے ناولوں میں علاقائی تہذیبی اقدار کی ترجمانی ملتی ہے محمود خان محمود بنگلوری کے ناول ’’ حیدر علی ‘‘ میں قدیم میسور کے علاقے دیوناہلی سری رنگا پٹنم جیسے علاقوں کے اس وقت کے سیاسی وسماجی حالات کا ذکر ملتا ہے اس میں تہذیبی اقدار سے زیادہ عسکری معاملات کا تذکرہ ہے ۔البتہ میمونہ تسنیم

کا ناول '' سوز ناتمام '' رومانی پس منظر کی وجہ سے ملناڈ کے قدرتی مناظر کی عکاسی ہے اس کی زبان شمالی ہندوستان کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے ۔

فرحت کمال کے ناول '' شیشے کے پائو ں '' مکمل طورپر بنگلور کے فضائوں میں تخلیق کی گئی ہے اس ناول میں یہاں کے سماجی سیاسی و معاشی حالات کاخاکہ ملتا ہے اس میں بنگلور کے علاقے سیٹی مارکیٹ ، وکٹوریہ روڈ اسپتال میں زندگی اور موت کی جنگ لڑنے والے کچھ پچھڑے افراد کی زبان ان کے رہن سہن ان کی فکر کا اپیچ کا بڑی خوبصورتی کے ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے ۔

انل ٹھکر کے تقریبا تمام ڈرا مو ں، ناولوں ا ور ا فسا نو ں میں ہبلی دھارواڈ اور شمالی کرناٹک کی فضائوں کی خوشبو محسوس کی جاسکتی ہے ۔خوابوں کی بیساکھیاں اور اوس کی جھیل میں ہبلی دھارواڈ کے علاقوں میں موجود لمبانی قبائل کے تانڈوں کے حالات ، ہندو رسم ورواج اور'' نیوگ '' کی رسم سیاسی رشہ کشی کا تفصیلی ذکر ملتا ہے ۔ گمشدہ شناخت کا موضوع فرقہ وارانہ خطوط پر قومی کہہ سکتے ہیں تاہم اس کے کردار اور ان کا رہن سہن مقامی رنگوں کا مظہر نظر آتا ہے ۔

مند رجہ ذ یل متفر ق ا قتبا سا ت اس کی مثا ل ہیں

پوڑ محلہ ہندو کسانوں سے آباد تھا مگر محلے میں عید اور دیوالی کی خوشیاں ایک سی ہوتی تھیں ۔ ''

عید کی نماز ہوئی نہیں کہ محلے کی کواڑینشیر خرما کی منتظر رہتی ۔دیوالی کے روز مولوی صاحب کا گھر
'' مٹھائیوں سے چھلکنے لگتا ۔

(غبار دیکھتے رہے ۔ صفر ضرب صفر ۔ انل ٹھکر ۔ ص 33)

اپنے چھوٹے سے گائوں نگم پیٹ کو تو انہوں نے اپنے رفقاء کے ساتھ مل کر ادب کا نرسری فارم بنا رکھا ہے ''

جہاں اردو کنڑ زبان کے نووارد ادباء شعراء ہر سو چپکتے نظر آتے ہیں وقتاً فوقتاً اطراف کے پہاڑوں کی چٹانیں

''غالب واقبال یا کوئمپو بیندرے کے بول گنگناتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں ۔

(آگے کیا ہوگا ۔ صفر ضرب صفر ۔ انل ٹھکر ۔ ص56)

آج کی نسل کس سمت میں گامزن ہے نہ باپ کا لحاظ نہ معلم کا پاس ۔ ہم نہ کبھی والد کے پاس بیٹھنا تو درکنار ان''

''کی موجودگی میں بیٹھنے کا حوصلہ بھی نہیں کیا ۔ ہمیشہ ہاتھ باندھے ادب سے کھڑے رہے --

(آگے کیا ہوگا ۔ صفر ضرب صفر ۔ انل ٹھکر ۔ ص57)

آ ئے دن تہوار جو بارہ دری کے شان و شوکت کو مدنظر رکھ کر منائے جاتے ہیں پھاگن میں پھاگ کھیلا جاتا ۔''

بہنیوں کی سہلیاں ٹڈی دلوں کی طرح اتر آتیں رنگ اڑاجاتا ہے رنگ رلیاں منائیں جاتیں ۔

(صفر ضرب صفر ۔ صفر ضرب صفر ۔ انل ٹھکر ۔ ص70)

ساون میں جھولے پڑتے بارش کی ہلکی ہلکی پھواریں جھولا جھولا جاتا عوامی گیتوں کی دھن دیوی کو بھگودیتیں ودت کا ''

سلسلہ شروع ہوجاتا ۔ اپواس رکھے جاتے ۔ میلہ ٹھیلہ لگتا ۔

(صفر ضرب صفر ۔ صفر ضرب صفر ۔ انل ٹھکر ۔ ص70)

موسمی پرندے ، معجزہ، ننھا شہوار ، گونگی چیخ چند ایسے نمائندہ افسانے ہیں جن مینعلاقائی تہذیبی مذہبی و ثقافتی جھلکیاں مل جاتی ہیناس کے علاوہ آپ کے ناول ''خوابوں کی بیساکھیاں'' کا تھیم خصوصاً ہبلی دھارواڈ کی طرز معاشرت اور دور آزادی کے حالات کا مرقع ہے ۔اس میں شامل علاقائی رنگ نیوگ کی رسم ، مٹھ کے علاوہ گڈگری گنڈپا کا شنڈے ، پولیس پاٹل دیش پانڈے بسوراج رام رائو ناڈگیر جیسے کردار شمالی کرناٹک کے زمیندارگھرانے ، ملازمت پیشہ افراد اور دہی علاقوں کے حالات کو بیان کرتا ہے آپ کے دیگر افسانوں اور ناولوں میں علاقائیت کے مرقع مل جاتے ہیں ۔

یوسف عارفی ریاست کے افسانہ نگاروں میں ایک ایسا نام ہے جن کے یہاں اپنے آبائی وطن ، اپنے خاندانی پیشے حکمت کی عظمت جلاوطن اپنی زبان اور تہذیب سے دور ہوتی ہوئی نسل کی داستان ملتی ہے ۔ '' اس کا دکھ '' بے سمت مسافر کا سفر ۔پھر سفر بے سمت ہوا، ایک کہا نی، مٹتی ہوئی اقلیتوں کے کا م ، ایک غیر ضروری آدمی ، ایک غیر ضروری آدمی کی آخری شاپنگ اور پڑوسی چند ایسے افسانے ہیں جن میں یوسف عارفی کے گائوں کرنکوٹ ، حکمت کا پیشہ ، حیدرآباد سے ہوتے ہوئے بنگلور آمد یہاں کے ماحول کا اپنے گائوں کے ماحول سے موازنہ بڑے خوبصورت انداز میں کیا گیا ہے ۔ اس کا دکھ میں جہاں ملک کے بٹوارے سے پیدا شدہ حالات اور مٹتی ہوئی تہذیب کی داستان ہے ۔ بوڑھے کے دو بیٹے اس کے دو مضبوط بازوں کی طرح ہیں یہاں دونوں بازوں سے مراد برصغیر ہند وپاک کی تقسیم ہے ۔ ایک کہانی مٹتی ہوئی اقلیت کے نام میں اردو زبان و ادب اور تہذیب کی زوال پذیر ی پر اظہار خیال ملتا ہے ۔ پڑوسی میں نشیشلی زندگی گزارنے کے لئے بت قرار ہے تو جبکہ بیوی اپنی سہیلی کے پاس گئی ہے ۔ اور روی ان دونوں سے بے نیاز بدلتے ہوئے اخلاقی اقدار فیشن زدگی پر غور کرتے ہوئے اس تصور کررہا ہے ۔ موصوف کے تمام افسانے گویا کرنکوٹ سے بنگلور کے طویل سڑکوں کے درمیان ماضی کا unfit معاشرے میں خود کو حصہ بننے والی تمام تر اقدار کی بازیافت کرنے کی کوشش کی ہے ۔

یوسف عارفی کی طرح خلیل خاور کو یہاں کے رہن سہن اور متوسط طبقے کے حالات سے اتنی دلچسپی ہے کہ آپ کے افسانے شعیب کی بکریاں آیات قصص قرآنی اور دیو مالائی کہانیوں کے ذریعے یہاں کے دیہاتوں اور یہاں بسنے والوں کے حالات کو بڑی چابکدستی کے ساتھ بیان کیا ہے ۔خلیل خاور مرحوم کی طرح خلیل منظری میسور سے وابستہ ایک اور سنئر افسانہ نگار ہیں جن کی تخلیقات میں میسور کے حالات کی جھلکیاں ملتی ہیں ۔ سماجی نوع میں اصغر چک منگلوری مرحوم فرحت کمال سمیرا ناظم ، کوثر پروین ، فریدہ احمت اللہ خاں ، رائوآنند ، حسنی سرور ، سلمی صنم ، ضیا کرناٹکی ، نعیم اقبال ، احمد عارف چند ایسے اہم نام ہیں جن کے افسانوں میں اپنے علاقے کی کہیں نہ کہیں نمائندگی ملتی ہے ۔ ان سے قطع نظر قاضی انیس الحق ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جن کے افسانوی میں علاقائی لب و لہجہ ، بنگلور کا پر فضا ماحول اور یہاں کی تہذیب رچی بسی ہوئی نظر آتی ہے ۔

فیاض قریشی کے افسانوں کے مجموعے '' پیاسا شہر پیاسے لوگ'' اور زیرو کنیڈول بلب میں شامل افسانے میں مقامات معاشرتی و معاشی حالات کی لفظی تصویر نظر آتے ہیں ۔ اب پچھتانے سے کیا ہوت ، عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے ، یہ احساس کا دھوکہ ، خون ، انتشار ، مسیحا کے مجرم ، بے نام رشتے ، عید ایسی بھی ،اور تہذیب کی موت ، اس ضمن میں چند قابل ذکر افسانے ہیں ۔ کوثر پروین کے افسانوں میں گلبرگہ کے علاقوں کی تہذیبی و تمدنی جھلکیاں دیکھی جاسکتی ہیں ۔ جبکہ سلنی صنم کے افسانوں میں موجودہ دور کی ہنگامہ خیز زندگی میں سوسائٹی پر ہورہے منفی اثرات کی طرف اشارے ملتے ہیں ۔

تجریدی افسانے لکھنے والوں میں حمید سہروردی اور اکرام باگ دو ایسے نام ہیں جن کے تجریدی و علامتی افسانوں میں ہمارے مٹتے ہوئے تہذیبی اقدار کی داستان بیان کی گئی ہے ۔ حیات ہندسہء عبت ، اقلی سے پرے ، اکرام باگ بے منظری کا منظر نامہ ریت ریت لفظ میں شامل افسانوں میں حمید سہروردی نے انتہائی چابکدستی کے ساتھ اپنی آبائی تہذیب کی اہمیت اور افادیت کو علامتی پیرائے میں بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے ۔ سن 2000 تک کی تخلیقات میں تہذیبی و علاقائی رنگوں کے واضح نقوش مل جاتے ہیں تاہم اس کے بعد کے افسانہ نگاروں کے ہاں موضوعات علاقائی معاشرتی و تہذیبی اقدار سے بے نیاز نظر آتے ہیں ۔

مندرجہ بالا فن کاروں نے اپنی تخلیقات کو مقامی رنگ دے کر بھی موضوع کے لحاظ سے انہیں آفاقیت عطا کی ہے ،ان تخلیقات میں موجود مسائل اور واقعات ہر علاقے اور ہر ریاست میں رنگ بدل کر نظر آجاتے ہیں اس لئے ان کی موضوعاتی وسعت میں کوئی تنگی یا علاقائی حد بندی نظر نہیں آتی ۔

ادھر اکیسویں صدی میں ریاست کے آسمان ادب پر ابھر نے والے چند ایک فکشن نگاروں کے یہاں موضوع اور زمانی و مکانی پس منظر کسی محدود دائرے میں نہیں ہوتا ۔ اس کا مکانی پس منظر عمومی ہوتا ہے ان میں اقدار سے کوئی وابستگی نظر نہیں آتی ہے اس میں نہ رشتوں کی قدریں ہیں نہ ہی مٹتے رسم ورواج کی بازیافت ۔

عادل شاہی دور سے لے کر بیسویں صدی کے آخر ی دہے تک تہذیبی اقدار کوجو اہمیت تخلیقی ادب میں حاصل تھی وہ وقت گزرنے کے ساتھ کم ہوتی جارہی ہے ۔یہ تہذیبی اقدار اب داستان پارینہ نظر آتے ہیں ۔